مطبوعات

(ادارہ)

تفسیر معالم القرآن: از جناب مولینا محمد علی صدیقی کاندھلوی۔ ناشر: دارالعلوم شہابیہ، رنگ پورہ روڈ، لاہور۔ سفید کاغذ پر اچھی طباعت۔ ایک ایک پارے پر مشتمل ۱۱ مضبوط جلدیں۔

قرآن پاک دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس سے ہر زمانے کے علماء اور مفسرین نے اپنے اپنے دور میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل اخذ کیا ہے۔ اردو میں متعدد مفسرینِ کرام نے قرآن پاک کی تفہیم و توضیح کے لیے مخلصانہ کوششیں کی ہیں۔ انھی بلند بخت مفسرینِ قرآن کی محفل میں سیالکوٹ کے مولانا محمد علی کاندھلوی بھی شامل ہیں۔

مولانا موصوف ہندوستان کے مشہور مردم خیز قصبہ کاندھلہ کے ایک معروف علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، دیوبند کے فاضل ہیں، سیالکوٹ کے دارالعلوم الشہابیہ کے ناظم اعلیٰ ہیں اور خطیب و واعظ ہونے کے علاوہ متعدد وقیع و مستند کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "معالم القرآن" یقیناً ان کا شاہکار ہے جو دنیا و آخرت میں ان کی عزت و سربلندی کا باعث بنے گا۔

"معالم القرآن" منفرد و ممتاز خصوصیات کی حامل تفسیر ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مولینا کاندھلوی محترم نے عربی، فارسی اور اردو کے ہر مفسر قرآن کی مساعی سے استفادہ کیا ہے اور جابجا ان کے حوالے دیے ہیں۔ اس طرح معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، نفسیاتی اور جذباتی مسائل جن میں قرآن اپنے مخصوص انداز میں رہنمائی فرماتا ہے، مولانا نے سلیس اور عام فہم انداز میں اس کی تشریح کر دی ہے۔ مولینا مسائل کے استنباط میں کسی خاص فقہی مکتبِ فکر تک محدود نہیں

رہے اور اسلام کو انہوں نے بحیثیت مکمل نظامِ حیات وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے۔

مولانا کاندھلوی کا اسلوب عام فہم ہے۔ اس طرح یہ تفسیر نہ صرف علماء اور دینی درسگاہوں کے طلبہ کے لیے متاعِ بے بہا ہے بلکہ عام قارئین اور درس قرآن دینے والے مبلغین کے لیے خصوصی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ یہ تفسیر ہر دینی و علمی لائبریری میں موجود ہونی چاہیے۔

(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)

------------O------------

اقبال کا نظریہ خودی: از جناب ڈاکٹر عبدالمغنی (پٹنہ یونیورسٹی)۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ صفحات ۵۴۲' کاغذ دبیز (کچھ کریم کلر کے قریب) کتابت و طباعت خوشنما' جلد مضبوط مع رنگین گرد پوش۔ حیرت ہے کہ پاکستان میں اس کتاب کا کوئی فروخت کنندہ نہیں۔ شاید علم کے خلاف قانون کی مصیبت ہو۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔

جواہر و خزف ریزوں کی چھانٹ پرکھ میں ژرف نگاہی رکھنے والے صاحبِ قلم کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں تنقید و توضیح کے ایسے بڑے کارنامے پر کیا لکھوں۔ کتاب پڑھتا ہوں تو میرے اندر کا تبصرہ نگار گم ہو جاتا ہے اور میں الفاظ کے ساغروں میں بھری ہوئی ادبی لطافتوں میں کھو جاتا ہوں۔ حواس بحال ہوتے ہیں تو سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی کے کام کا پھیلاؤ عمودی اور افقی دونوں طرح سے ہے اور بڑی تیزی سے اس پھیلاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص بات یہ کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کے قلم کا مرکزِ طواف (۱۹۵۷ سے) اقبال ہے۔

میں کچھ اور لکھ سکوں یا نہیں' یہ ضرور لکھنا چاہتا ہوں کہ جدید دور کی نہایت سنگلاخ اور مہیب اور معماتی و جناتی تنقید نگاری میں بڑے درجے اور بڑے کام کے ساتھ نمودار ہونے والا یہ پہلا مبصر ہے۔ یہ پہلا مبصر ہے جس کے ہاں مغربی ادب پر حاوی ہونے اور اس کا استاذ ہونے کے باوجود' مغربیت کا آسیب مسلط نہیں ہے۔ جس نے اغیار کے ہاں سے اصطلاحیں نہ چرائی ہیں' نہ بھیک میں لی ہیں۔ اپنی اصطلاحیں خود بنائی ہیں جو بہت عام فہم ہیں' بڑی بڑی "چٹانیں" آپ کو کہیں نہ ملیں گی جن کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ مرعوب کر دیتی ہیں اور ابہام' ایہام یا اوہام کا کہر بھی ان کے گرد چھایا ہوا ہو تو پھر تو چڑیلیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عبدالمغنی کی تنقیدی تحریر کو آپ پڑھیں تو بھول جائیں گے کہ یہ نقد و نظر کا قصہ ہے' بلکہ یوں

لگے گا کہ ایک تازہ نگارش سامنے آرہی ہے جس میں فقروں کی خوبصورتی اور معانی کی لعانی اور فصاحت و بلاغت کی لطافت جابجا پھیلی ہوئی ہے گویا ہر ورق "دامان باغبان وکفِ گلفروش" ہے۔ کتاب کو دیکھ کر بار بار جی چاہتا ہے کہ اس کی عبارات کو پڑھوں۔

فی الحقیقت اقبال کو تنقیدی میزان پر تولنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ لوگ اسکے اشعار کی صحیح معنویت، اس کے فنی مقام، اس کے ایمانی و فکری پس منظر اور اس کے ہدفِ حقیقی کو سمجھیں۔ یہ چیزیں واضح ہونگی تو تنقید و تبصرہ از خود ساتھ ساتھ ہو جائیگا جیسے دودھ کے پیالے میں بالائی گویا "بالائی آمدنی" ہوگئی جو حلال بھی ہے۔ اقبال جن کھینچا تانیوں کا شکار رہا ہے اور جس طرح اس کے فکر و فن کے پارچے اپنی اپنی پسند کے مطابق لوگوں نے اٹھا کر خوانچے لگائے اور آوازیں لگائیں کہ "من قاش فروش فن صد پارہ اقبال"۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کا تنقیدی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے قاش فروشانِ شعر اقبال کا راستہ تصریحات اور وضاحتوں اور تفہیم اقبال سے روک دیا اور پھر ساتھ ساتھ معترضین یا غلط اندیشیوں کے مریضوں کی چارہ گری کے لیے مضبوط دلائل کی اکسیر کو جواباً استعمال کیا۔ اس معاملے میں اقبال شاید غیر معمولی حد تک مظلوم ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید اقبال کی مظلومیت کا مداوا بھی کرتی ہے اور اس کے فکر و فن کی پرکھ کا کام بھی کرتی ہے۔

خودی اقبال کے فلسفے اور فکر کا مرکزی نکتہ ہے۔ یہ کتاب درحقیقت اسی نکتے کا مفہوم نمایاں کرنے کے لیے لکھی گئی ہے کہ اقبال نے کیا سوچا؟

بدقسمتی سے میرے مقدر میں تعارف کتب کے صفحات ضرورت سے کم ہیں اور اس کتاب پر تبصرہ نگار کو ایک جامع نوٹ لکھنے کے لیے کئی صفحے درکار ہیں۔ بہرحال چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے بھی کچھ زیادتی ہو سکتی ہے۔

بالفاظ ڈاکٹر عبدالمغنی "اقبال کے نظام افکار کے عوامل و عناصر کی تنقیدی تشریح و توضیح" (سرورق) کو وہ اپنے والد مرحوم مولینا سید عبدالروف کے نام سے معنون کرتے ہیں "جو اپنی حدود میں "خودی" کا ایک نمونہ تھے۔"

ابتدائی مضمون میں لکھتے ہیں کہ "سارتر کی وجودیت سے اقبال کی خودی کا موازنہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ مستقبل کا نظریہ بننے کی صلاحیت اسی میں ہے، نہ کہ وجودیت میں!" (ص ۱۲) "خودی ایک بہت سادہ سی فطری چیز ہے، جسے ہم بآسانی عرفان ذات کہہ سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو پہچاننا، اپنی حد میں رہنا، اپنے نفس کی معرفت، اس کا تزکیہ، اسکی ترقی، شخصیت کی تعمیر، جوہرِ ذاتی کی

پرورش، کردار کی تشکیل و تہذیب۔" (ص ۱۴)

"خودی کی یہ موت حیات پر ایک ضرب ہے اور پوری کائنات کا زیاں" ..... "وہ زمین پر نائبِ خدا ہے۔ اس کی جنت اس کے خونِ جگر میں ہے۔ محاورے میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ دنیا کو جنت بنانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے عروج کی کوئی حد بندگی رب کے سوا نہیں" (ص ۱۴)

"یہ خود آگاہی، خود نگری اور خود گری ہے۔" ------ "یقیناً اس میں انفرادیت کی بو ہے مگر وہ اجتماعیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ جدت وہی معتبر و موثر ہوتی ہے جس کے پیچھے کوئی روایت بنی ہوئی ہو اور جس کے آگے ایک روایت بننے والی ہو۔

یہ سوال کہ خدا کے ساتھ خودی کے ارتباط سے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں، ڈاکٹر صاحب تین چار نکات میں ایک ارتقا کو لیتے ہیں۔ مگر وہ اس مرعوب کن مفروضہ کا رخ ہی بدل دیتے ہیں۔ لکھا کہ:

> "یہ تنازع البقا کسی حیوانی ارتقا کے لیے نہیں ہوتا اور بقائے اصلح کا مطلب وحشیانہ طاقت کی برتری نہیں ہے۔ دنیا میں ترقی کی اصل کشمکش خیر و شر کی قوتوں کے درمیان ہے۔ روئے زمین رزم گاہِ خیر و شر ہے .... خیر زینتِ وجود ہے اور شر ننگِ ہستی۔ انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی خودی کا عمل اسی آفاقی صداقت پر مبنی ہو چاہیے۔" (ص ۲۱)

اسی کے ساتھ دوسری بحث جبر و قدر کی ہے، وہ پوری ہی دلچسپ ہے مگر ایک جملہ عرض ہے۔ "جو ہو چکا وہ تقدیر تھی، جو ہونے والا ہے اس کی تدبیر کرنی چاہیے (ص ۲۱) تقدیر خدا کی ہے اور تدبیر خودی کی۔" (ص ۲۲)

پھر لکھا کہ "ازل اور ابد کے درمیان وہ (انسان) کائنات کا سب سے اہم وجود ہے" عبدہ (بندہ خدا) کا مقام سدرۃ المنتہیٰ (کائنات کی سرحد آخریں) تک وسیع ہے۔" (ص ۲۳) خودی کا مرد کامل خیر البشر ہے۔ (ص ۲۴)

اقبال فہمی کے لیے اس وقت کے مغرب کی ماہیت کو دو صفحوں میں بڑی خوبی سے سمجھایا گیا ہے۔ اس کا ایک جملہ یہ ہے کہ "وہ (یعنی انسان) جتنا جتنا کائنات کے مظاہر دریافت کر رہا تھا، اتنا ہی اتنا اپنی ذات کو گم کرتا جا رہا تھا" (ص ۲۶)۔ پھر مشرق کا حالِ زار بیان کیا تو ایک نشتر سا دل میں اتار دیا کہ "اورنگ زیب کی وفات کے پچاس سال بعد ہی ہندوستان کے محاذ پر مشرق نے

مغرب سے پہلی شکست کھائی۔ ۱۷۵۰ میں ایشیا کی سب سے بڑی طاقت کا جو زوال شروع ہوا۔ فقط سو سال کے اندر ۱۸۵۷ میں اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا۔" ------- "فوجی غلبے' سیاسی طاقت اور معاشی ترقی نے بالاخر علم و دانش اور تعلیم و تہذیب کا قبلہ بھی مغرب کو بنا دیا جس کی تقلید مشرق کا مقدر بن گئی۔" (ص ۲۸)..... "لیکن مشرق پورے طور پر مغرب نہیں بن سکتا تھا' چنانچہ وہ دو دنیاؤں کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا..... پرانے عقیدوں پر یقین متزلزل ہو گیا..... اہلِ مشرق کے کردار میں منافقت آگئی (ص ۲۷) یہ پورے نوٹس پڑھنے کے ہیں۔ اس قصہ کے خاتمے کا جملہ توجہ طلب ہے کہ:

> "دم توڑتے ہوئے برطانوی سامراج کی آخری لات برصغیر کے مونہہ پر پڑنے والی تھی۔ ایک دہشت کی فضا طاری ہو رہی تھی۔ اس دہشت کو دور کرنے کے لیے اقبال نے ایک نسخہ تجویز کیا اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔" (ص ۳۰)

بقول اقبال ؎ تپیدم' آفریدم' آرمیدم! ڈاکٹر صاحب نے اوپر کی دو سطروں میں اقبال کو تاریخی احوال کے منظر نامے میں صحیح مقام پر کھڑا کر کے ان کی خدمت میں نہایت ہی خوبصورت خراجِ تحسین اس کارنامے کے لیے پیش کیا ہے جسے وہ انجام دے گئے۔

پھر زیر عنوان انسانیت ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب نے جو خوبصورت تحریر مرحوم کے اشعار کے ساتھ لکھی ہے' اس میں سے چند فقرے -----"دراصل پوری انسانیت کا فروغ اقبال کا مطمح نظر ہے۔"...... "عالم بشریت کی زد میں ہے۔ گردوں' عروج آدم خاکی' فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں اور روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' وہ ارتقائے انسانی کا ایک دستاویزی اعلان ہے۔ انسان کے موضوع پر اس سے بہتر اور حسین تر کوئی تخلیق جہانِ ادب میں موجود نہیں۔" ....."وہ (اقبال) ایک عالمی معاشرے کے پیغام بر تھے۔" ..... (چاہتے تھے کہ) ایک صالح انقلاب کے لیے کام کیا جائے۔" (ص ۳۲) .... "اس پس منظر میں وہ ملّتِ بیضا کو ایک کلیدی اہمیت اور مرکزی حیثیت دیتے تھے۔" ..... "کیونکہ توحید کی امانت صرف اسی ملت کے سینوں میں محفوظ تھی" (ص ۳۳)۔ پھر اقبال کے اشعار کو گواہ بنا کر ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کو عصر حاضر کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ "ان کا خیال تھا کہ ایک نئی دنیا پیدا ہو گی جس میں ایک نیا انسان سانس لے گا اور وہ ایک نئے نصب العین کے ساتھ ارتقاء کی بلند تر منزلوں کی طرف گامزن ہو گا۔" (ص ۳۷)

ڈاکٹر عبدالمغنی نے اقبال کی نگارشات کی نہایت موزوں ترتیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے سب

بقیہ بر صفحہ ۲۷